باب چہارم

اخلاق اقدار اور تعمیر شخصیت کے پہلو

اخلاق خُلق کی جمع ہے جسکا معنی ہے طبع۔ یہ اس کیفیت کا نام ہے جس پر انسان اپنی قوت میں سے بعض قوتوں پر عادت کے ذریعے مستقل اور قائم ہو جائے۔ علامہ ابن منظور اپنی مشہور کتاب لسان العرب میں خُلق کی تشریح یوں کرتے ہیں:

> خُلق کا معنی فطرت اور طبیعت ہے انسان کی باطنی صورت کو اس کے اوصاف اور مخصوص معانی کو خُلق کہتے ہیں، جس طرح اس کے ظاہری شکل وصورت کو خُلق کہا جاتا ہے۔

امام الغزالی جو حکمت و فلسفہ کے علاوہ نفسیات انسانی کے بھی ماہر ہیں خُلق کی تشریح یوں کرتے ہیں:

> خُلق نفس کی اس پختہ کیفیت کا نام ہے جس کے باعث اعمال بڑی سہولت اور آسانی سے صادر ہوتے ہیں ان کے کرنے کے لیے سوچ بچار کے تکلف کی ضرورت نہیں ہوتی۔

چنانچہ خُلق کا اطلاق ایسی پختہ عادات و خصائص پر ہوگا جن کی جڑیں قلب و روح میں بہت گہری ہوں۔ اس مجموعہ اعمال کا نام ہے جو دیکھنے والے کو نظر آ رہا ہے۔ یہی کردار جب طبیعت میں بہت حد تک راسخ ہو جاتا ہے اور انسان کی

شخصیت پر اپنا گہرا رنگ جما لیتا ہے تو اسے اخلاق کہتے ہیں۔ اخلاق کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ دیگر مذاہب میں اخلاقی اقدار کی بنیاد کسی انسان کا قول ہو سکتی ہے۔ لیکن دین اسلام میں خوف خدا کے بغیر کسی کام کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ یہ بنیاد جتنی مضبوط ہوگی۔ اخلاق میں اتنی ہی خوبی اور پائیداری آئے گی۔

اسلام کا فلسفہ اخلاق محض چند اچھی چیزوں کو اچھا سمجھنے کا نام نہیں، بلکہ عملی طور پر ان پر قائم رہنا احسن خُلق ہے۔ اسلام قول و فعل دونوں میں توازن پیدا کرتا ہے اور اسلام کا پیش کردہ کوئی بھی ضابطہ ایسا نہیں جس پر عمل نہ کیا جا سکے۔ ایک مثال سے اسے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول منقول ہے کہ اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اسے پیش کر دو۔ یہ قانون موسوی قانون کی شدت کے مقابلے میں اس وقت ضروری تھا لیکن ہر وقت قابل عمل نہیں کیونکہ یہ قانون انسانی فطرت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اسلام نے اخلاق اور قانون میں توازن قائم رکھا۔ عدل کا تقاضہ یہ ہے کہ مارنے والے سے بدلہ لیا جائے اور یہی اسلامی قانون کا حکم ہے۔ مگر اس کے برعکس اخلاق کا تقاضہ یہ ہے کہ اس سے درگزر کیا جائے اور معاف کر دیا جائے۔ گویا اسلام کا پیش کردہ ضابطہ اخلاق ایسا ہے جس پر ہر حالت میں عمل ممکن ہے۔ اسلامی فلسفہ اخلاق میں ہر پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس پر عمل درآمد سے نہ کسی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے اور نہ انسانی وقار و عزت کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

اس فلسفے میں تمام اخلاقی خوبیوں کی مکمل تصویر ہے۔ کوئی نیکی و خوبی ایسی نہیں جس کا ذکر اسلام میں نہ ہو۔ زندگی میں مختلف کیفیات انسان پر طاری رہتی ہیں۔ دُکھ سُکھ تندرستی بیماری بھوک فراخی سفر و حضر۔ غرض اسلام کا ضابطہ حیات اس حد تک مکمل ہے کہ اس میں انسان کی سب حالتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

انسان جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے وہ دین فطرت پر پیدا ہوتا

ہے۔ وہ ہر برائی سے پاک ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اسے بعد میں تربیت دے کر یہودی و نصرانی بنا لیتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ تربیت ہی انسان کو شخصیت عطا کرتی ہے اگر تربیت اخلاقی اصولوں اور ضابطوں کے مطابق ہوگی تو شخصیت بھی تعمیری ہوگی۔ ایک مسلمان اخلاقی اقدار کو اپنا کر اپنے کردار کی تعمیر کرتا ہے۔ اسی لیے ایک مسلمان اعلیٰ شخصیت کا علمبردار ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب اور تہذیب ایسی شخصیت اور کردار پیدا نہیں کر سکتی جو اسلام کے اخلاق حسنہ پیدا کرتے ہیں۔

اسلامی ضابطہ اخلاق کے دو پہلو ہیں۔

دایاں پہلو اخلاق حسنہ کا ہے جس میں اچھے اخلاق کا حکم دیا گیا ہے۔

اخلاق حسنہ وہ اعمال و افعال ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات کا پرتو ہیں۔ جنھیں اسلام نے اچھا سمجھا اور ان کے کرنے کا حکم دیا۔ جس میں تقویٰ، صدق، سخاوت، عفت، دیانتداری، رحم، عدل و احسان اور ایفائے عہد وغیرہ شامل ہیں۔

بایاں پہلو رزائل اخلاق کا ہے جس سے اخلاق و کردار کو نقصان پہنچتا ہے۔ اسلام نے ان سے بچنے کا حکم دیا۔ ان میں تکبّر، غیبت، منافقت، خوشامد، جھوٹ وغیرہ شامل ہیں۔ ان دونوں پہلو کو امر و نہی کہا جاتا ہے۔

قرآن حکیم میں جہاں جہاں بھی عبادات بجا لانے کا حکم آیا ہے وہاں عبادات کی غرض و غایت ہی اخلاق بیان کی گئی ہے۔ نماز کے متعلق ذکر آیا تو یوں بیان ہوا:

''بے شک نماز بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے۔''

روزہ رکھنے کا حکم ملا تو ساتھ یہ مقصد بیان ہوا:

''تاکہ تم تقویٰ حاصل کر سکو''

اور یہی مقصد زکوٰۃ ادا کرنے اور حج کرنے کا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید نے اخلاقی نظام پر گہرے، وسیع اور دیرپا

اثرات مرتب کیے ہیں۔قرآن پاک نے جو اخلاقی نظام دیا اس کی مکمل تشریح تو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں البتہ اس کے اِخلاقی اصولوں میں سے چند مثال کے طور پر بیان کیے جاتے ہیں:

☆ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ عزیز و اقارب، یتیم ومحتاج، پڑوسی اور رفیق سفر مسافر وغلام کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

☆ اہل ایمان کی صفت یہ ہے کر جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل بلکہ درمیانی راہ اختیار کرتے ہیں۔

☆ اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔عزیز و اقارب پر خرچ کرنے کی تاکید فرماتا ہے اور فحش منکر اور زیادتی سے منع کرتا ہے۔

☆ جو لوگ خوشحالی و تنگی میں صدقہ خیرات کرتے ہیں غصہ کو ضبط کرتے ہیں عفوو درگزر سے کام لیتے ہیں انھیں اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے۔

☆ ایمان والوں کو حکم دو کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور عفت اختیار کریں۔

☆ کسی قوم کا عناد تمہیں عدل کی راہ سے نہ بھٹکا دے۔

☆ عدل و انصاف پر قائم رہو۔

☆ سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں اس لیے ان میں صلح و آشتی پیدا کرو اور اگر کوئی دو گروہ آپس میں جھگڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو۔

☆ تم میں سے خدا کی نگاہ میں وہ افضل ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

حاصل بحث یہ ہے کہ پورا قرآن مجید ایسی بلند اخلاقی تعلیمات سے پُر ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ بطور معلمِ اخلاق

قرآن مجید نے حضور نبی کریم ﷺ کی بعثت کا مقصد لوگوں کو اچھے اخلاق سے آراستہ کرنا بتایا ہے۔ارشاد خداوندی ہے:

’’اللہ وہ ذات ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں اپنا رسول

بھیجا جو انہی میں سے ہے۔ وہ ان کے سامنے اللہ کی آیات
پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو گناہوں سے پاک وصاف کرتا ہے
اور ان کو کتاب کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت کی باتیں سکھاتا
ہے۔" (جمعہ 62 : 2)

گویا اسلام نے اخلاق کے جو تصورات دیئے ان کی تفصیل حدیث نے پیش کی۔ حضور نبی کریم ﷺ نے قرآن مجید کے اشاروں کی وضاحت اس کے کلیات کی تصریح، اس کے اصولوں کا عملی اطلاق اور اس کے احکامات کی تشریح کا فریضہ انجام دیا۔ حضور نبی کریم ﷺ کی ذات مبارک اسلامی ضابطہ اخلاق کی عملی تفسیر بنی جس کی تصدیق قرآن نے ان الفاظ میں کی:

"بیشک آپ ﷺ خُلقِ عظیم کے مالک ہیں۔"

اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

مجھے اس لیے مبعوث کیا گیا کہ میں مکارم اخلاق کو پایہ تکمیل
تک پہنچا دوں بے شک معلّمِ اخلاق کی تَعلیمات ہمہ گیر اور
عالمگیر ہیں۔

حضور ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں کوئی ایسی بات بیان نہیں فرمائی جس پر خود عمل نہ کر کے دکھایا ہو۔ اگر لوگوں کو سچ بولنے اور امانت میں دیانت کو ملحوظ رکھنے کی تاکید فرمائی تو خود راست گفتاری اور امانت داری کا وہ بلند معیار پیش کیا کہ خون کے پیاسے بھی آپ ﷺ کو صادق وامین کہنے پر مجبور ہو گئے۔ لوگوں کو وعدہ پورا کرنے کی تلقین کی تو خود بھی اس پر یوں کاربند ہوئے کہ دشمن بھی عش عش کر اُٹھے۔

قیصر روم نے ابوسفیان کو اپنے دربار میں طلب کیا تا کہ حضور نبی کریم ﷺ کے اخلاق و کردار کے بارے میں دریافت کرے۔ ابو سفیان اس وقت اسلام اور آپ ﷺ کا بدترین دشمن تھا۔ لیکن اس کو بھی مجبوراً کہنا پڑا کہ آپ

ﷺ کے اخلاق بہت بلند ہیں۔ وہ قول کے پکے اور بات کے سچے ہیں۔ عرب کے بدو اور جاہل لوگ حضورﷺ کے اخلاق کریمانہ کو دیکھ کر حضورﷺ کے گرویدہ ہو گئے تھے۔

مسجد نبوی کی تعمیر میں جب صحابہ کرامؓ اس کی بنیادیں کھود رہے تھے۔ پتھر گارا اُٹھا اُٹھا کر لا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا حبیبﷺ بھی ان کے ساتھ برابر کا شریک تھا۔ غزوہ احزاب کے موقع پر جب سارے مشرک قبائل نے مدینہ منورہ پر دھاوا بول دیا۔ اسلام کے اس مرکز کے دفاع کے لیے جب خندق کھودنے کا منصوبہ طے پایا۔ صحابہ کرامؓ کی طرح حضورﷺ ہاتھ میں کدال لیے خود بھی خندق کھودنے میں مصروف ہیں۔ گیسوئے عنبرین پر مٹی گر رہی ہے۔ روئے زیبا پر گرد پڑ رہی ہے اس روح پرور منظر کو دیکھ کر مجاہدین اسلام پر کیف و مستی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ بے خودی کی حالت میں یہ شعر پڑھتے ہیں:

> ہم وہ جاں فروش ہیں جنھوں نے محمد مصطفیٰﷺ کے دست
> مبارک پر تا دم واپسیں جہاد کی بیعت کی ہے۔

سرور دو عالم ہادی برحقﷺ ان کے جوش ایمانی کو دیکھ کر جواباً فرماتے ہیں:

> ”اے اللہ زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے الٰہی میرے
> انصار و مہاجرین کو بخش دے۔“

لشکر اسلام میدان بدر کی طرف کوچ کر رہا ہے تین تین سپاہیوں کے لیے ایک ایک سواری کا انتظام ہو سکا ہے۔ حضور سرور دو عالمﷺ نے بھی اپنی سواری میں سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور مرثد بن ابی مرثد کو شریک کر لیا۔ مدینہ منورہ سے جب یہ لشکر نکلا تو حضورﷺ اونٹنی پر سوار ہیں۔ مقررہ مسافت طے کرنے کے بعد حضورﷺ سواری سے اُتر جاتے ہیں۔ اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان میں سے ایک سوار ہو جائے۔ جان نثار صحابہؓ عرض کرتے

ہیں ان کی باری پر بھی حضورﷺ ہی سوار رہیں اس سے انھیں روحانی مسرت ہوگی۔ اب حضورﷺ جانتے ہیں کہ یہ پیش کش صدق دل سے کی گئی ہے لیکن حضور نبی کریمﷺ یہ بھی جانتے ہیں کہ حضورﷺ کا مقام اقدار عالیہ کے معلّمِ اور اُستاد کا ہے۔ حضورﷺ ان کی اس مخلصانہ پیش کش کو قبول نہیں فرماتے اور یوں جواب دیتے ہیں:

''نہ تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو اور نہ یہ کہ تمہیں مجھ سے زیادہ اجروثواب کی ضرورت ہے''

اب چرخ نیلی فام نے بھی یہ منظر دیکھا ہوگا لشکر کا سپہ سالار اُمت کا سردار مجاہدین کا محبوب قائد اونٹنی کی نکیل ہاتھ میں پکڑے پیدل چل رہا ہے اور ایک سپاہی اونٹنی پر سوار ہے۔ یہی وہ اسوہ حسنہ ہے جس نے سب کے دلوں کو موہ لیا۔ یہی وہ اخلاق کریمانہ تھے جنھوں نے سب کو حضورﷺ کی محبت کا اسیر بنالیا۔ یہی وہ سیرت کا بلند معیار تھا جس نے عرب جیسی وحشی قوم کو کاروان انسانیت کا امام بنادیا۔

اسوۂ حسنہ میں ہم نے مکارم اخلاق کی مکمل جھلک دیکھ لی۔ اب اخلاقی فضائل پر آپﷺ کے ارشادات دیکھتے ہیں تاکہ اخلاقی اقدار کی اہمیت ذہنوں میں پختہ ہوسکے۔ فرمایا:

☆ تم میں بہترین وہ ہے جو اخلاقاً بہترین ہے۔

☆ تم میں سے مجھے سب سے پیارا اور آخرت میں سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہوگا جو خوش خُلق ہے اور تم میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور روز قیامت مجھ سے دور وہ ہوگا جو بداخلاق ہے۔

☆ قیامت کے دن عدل کے ترازو میں حسنِ اخلاق سے بڑھ کر کوئی چیز وزنی نہ ہوگی۔

☆ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہوتا

ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں۔

ایک دفعہ حضورﷺ سے کسی نے پوچھا کہ سب سے زیادہ بڑھ کر کونسی چیز جنت میں لے جاتی ہے۔ فرمایا:

☆ اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اور حسنِ خُلق۔

☆ مومن اپنے حسنِ خُلق سے روز دار نمازی کا درجہ پا لیتا ہے۔

ایک بار فرمایا:

جو اپنے خُلق کو سنوارے میں اس کے لیے خُلدِ بریں میں گھر کا ذمہ لیتا ہوں۔

اچھے اخلاق پیدا کرنا ممکن ہے

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انسان جس ظاہری صورت پر پیدا ہوتا ہے وہ اسی طرح رہتی ہے۔ بدلتی نہیں مثلاً بدصورت خوبصورت نہیں ہوسکتا اور خوبصورت بدصورت نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح انسانی اخلاق جو باطن کی تصویر ہیں وہ بھی نہیں بدلتے۔ مگر اخلاق کے معاملے میں یہ مقولہ صحیح نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کسی کو ادب سکھانا کسی پر محنت کرنا اور نصیحت کرنا سب فضول ہوتا۔ حالانکہ نبی کریمﷺ کا ارشاد ہے:

''اپنی عادات کو خوبصورت بناؤ''

اور یہ بات اس لیے ممکن ہے کہ اگر آدمی محنت کر کے ایک جانور کو سدھار لیتا ہے تو اپنے اخلاق کو کیوں نہیں سنوار سکتا۔ واضح رہے کہ کاموں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن میں انسان کے اختیار کو دخل نہیں۔ جیسے کھجور کی گٹھلی سے سیب کا درخت پیدا کرنا ممکن نہیں، لیکن اس گٹھلی سے کھجور کا درخت تو ممکن ہے۔ اگر انسان محنت و نگہداشت کرے تو درخت پروان چڑھ سکتا ہے۔ غُصہ اور نفسانی خواہشات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا انسان کے اختیار

میں نہیں مگر ریاضت اور محنت سے اعتدال پر لانا ممکن ہے اور یہ بات تجربے سے ثابت ہے۔ گو بعض لوگوں کے حق میں یہ کام بہت دشوار ہوتا ہے مگر اخلاقیات کے زُمرے میں یہ مشکلات دو سبب سے ہیں۔ اول تو یہ کہ انسان فطرتاً غصیلا ہو اور نفسانی خواہشات کا تسلط مضبوط ہو دوسرے یہ کہ آدمی ایک طویل عرصے تک ان کا تابع فرمان رہا ہو جس کی وجہ سے وہ عادات پختہ ہوگئی ہوں۔ اس معاملے میں لوگوں کی چار قسمیں ہیں۔

☆ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو بہت سادہ ہوتے ہیں اور انھیں نیک و بد کی شناخت نہیں ہوتی اور وہ اچھے بُرے کام کی عادت ہی نہیں ڈالتے۔ ایسے لوگ نصیحت و تربیت کا اثر جلدی قبول کرتے ہیں۔ مگر ایسے افراد کے لیے ایک استاد کی ضرورت ہوتی ہے جو انھیں تعلیم و تربیت دے، بُرے اخلاق کی تباہ کاریوں سے انھیں آگاہ کرے۔ تمام بچے ابتداء میں ایسے ہی ہوتے ہیں۔ والدین ان کے حق میں راہنما ہوتے ہیں لیکن اکثر والدین انھیں دنیا کا لالچی اور حریص بنا دیتے ہیں اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں کہ اپنی مرضی سے جس طرح چاہیں زندگی بسر کریں۔ جبکہ بچوں کے دین اور اخلاق کی حفاظت والدین کے ذمے ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''تم لوگ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ''

☆ دوسری قسم یہ ہے کہ آدمی فی الوقت بدعقیدگی کا شکار نہ ہو لیکن بُرے اخلاق و عادات کا عادی ہو۔ اس کا راہ راست پر لانا ذرا مُشکل ہوتا ہے۔ ایسے افراد کو بُرے اخلاق و عادات کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے اور ان کے اندر خیر و اصلاح کا بیج بویا جائے۔ اگر وہ بات مان کر از خود کوشش شروع کر دیں گے۔ وہ جلدی راہ راست پر آ جائیں گے۔

- ☆ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو برائی کے خوگر ہو جاتے ہیں یعنی ان کے اندر بُرے اخلاق کی عادت اسقدر پکی ہو جاتی ہے کہ وہ برائی کو پسند کرتے ہیں ایسے لوگ نصیحت کا اثر کم ہی قبول کرتے ہیں۔
- ☆ چوتھی قسم ان لوگوں کی ہے جو برائی کرتے ہیں پھر اس پر فخر و تکبر کرتے ہیں جیسے بعض لوگ یہ کہتے ہیں ۔ ہم نے اتنے آدمیوں کو قتل کیا یا اتنی شراب پی۔ایسے لوگوں پر آسمانی سعادت کا نزول ہو جائے تو الگ بات ورنہ ان کا راہ راست پر آنا بہت مشکل ہے۔

علاج کا طریقہ

جو شخص بُرے اخلاق سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ برے اخلاق جس طرف لگانا چاہیں اس کے خلاف عمل کرے۔ کیونکہ مخالفت ہی خواہشات کو ختم کرتی ہے اور ضد ہی اصل علاج ہے۔ جس طرح گرمی سے پیدا ہونے والی بیماری کا علاج سردی ہے اس طرح جو بیماری غصہ سے پیدا ہو اس کا علاج بُردباری ہے، جو تکبر سے پیدا ہو اس کا علاج عاجزی ہے۔ بخل سے پیدا ہونے والی بیماری کا علاج خرچ کرنا ہے الغرض جو شخص نیک کاموں کی عادت ڈالے گا اس کے اندر اچھے اخلاق ضرور پیدا ہو جائیں گے۔

اخلاق حسنہ کے عناصر کا مختصراً جائزہ

صدق

انسانی کردار کی تعمیر میں اور سیرت کی تشکیل میں صدق کا حصہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ منطقی نتائج کے اعتبار سے صدق تمام اخلاق فضائل میں افضل ہے۔ کیونکہ اس ایک فضیلت کا حامل انسان دوسری بے شمار فضیلتوں سے آراستہ ہو جاتا ہے۔ صدق کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سچ بولنے والا گناہوں سے محفوظ رہتا ہے اور قلبی طور پر مطمئن ہوتا ہے۔ صدق انسان میں شجاعت اور بہادری پیدا کرتا ہے اور جھوٹ انسان میں بزدلی اور منافقت پیدا کرتا ہے۔ صدق کے اثرات پوری زندگی پر ظاہر ہوتے ہیں۔ صدق سے خلوص پیدا ہوتا ہے اور فضائل حسنہ کے چشمے پھوٹنے میں اور عمل میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

صدق کے لغوی معنے سچ کہنا راست ہو جانا ہے

اور سچائی اختیار کرنے والے کو صدیق کہا جاتا ہے۔ صدیقین کا ایک مخصوص گروہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام یافتہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا مستحق جن گروہوں کو قرار دیا ان میں صدیق بھی شامل ہیں اور اس گروہ کا ذکر انبیاء کے فوراً بعد کیا گیا۔

صدق کی صفت اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں بھی شامل ہے اور قرآن حکیم میں جا بجا اس صفت کا تذکرہ ہوا ہے:

''اور بات میں اللہ سے زیادہ سچا کون ہے''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

''اے نبی کہہ دیجئے اللہ نے سچ کہا''

سورۃ توبہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اے ایمان والوں اللہ سے ڈرو اور سچ بولنے والوں کے ساتھ ہو جاؤ''

سورۃ احزاب میں سچ بولنے والی عورتوں اور سچ بولنے والے مردوں کی تعریف کی گئی ہے اور ان سے اجر عظیم کا وعدہ فرمایا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''سچائی انسان کو نجات دیتی ہے اور جھوٹ ہلاک کرتا ہے''

ایک اور حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ:

''ایک شخص سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں صدیقین میں لکھا جاتا ہے اور ایک شخص جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ کذاب لکھ لیا جاتا ہے''

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''تم پر سچائی لازم ہے ہمیشہ سچ بولو کیونکہ سچ بولنا نیکی کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور نیکی جنت تک لے جاتی ہے۔ جب کوئی ہمیشہ سچ بولتا رہتا ہے تو وہ صدیقین میں لکھ لیا جاتا ہے۔''

ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا یارسول اللہ ﷺ، مجھ میں چار بُری خصلتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بدکار ہوں۔ دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں۔ تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں اور چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا

ہوں۔ ان میں سے ایک بُری عادت چھوڑ سکتا ہوں۔ آپ ﷺ بتائیے کہ کون سی عادت چھوڑوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''جھوٹ بولنا چھوڑ دو''۔

جب رات ہوئی اس شخص نے شراب پینا چاہی اور پھر خیال آیا کہ حضور ﷺ پوچھیں گے تو سچ کہنا پڑے گا اور رسوائی ہوگی۔ اس لیے شراب کا خیال چھوڑ دیا۔ اس کے بعد بدکاری کو جی چاہا مگر جب یہ دھیان آیا کہ آنحضرت ﷺ پوچھیں گے تو سچ بتانا پڑے گا اور راز کھل جائے گا تو بدکاری کا ارادہ توڑ دیا۔ اس کے بعد چوری کی نیت کی۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ سچ بتانا پڑے گا یہ ارادہ بھی ترک کر دیا۔ پھر اس طرح صبح ہوئی تو دوڑ کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوااورعرض کی یا رسول اللہ ﷺ، جھوٹ نہ بولنے کے عہد سے میری چاروں بُری خصلتیں مجھ سے چھوٹ گئیں۔ اس طرح وہ شخص ایک سچ کی وجہ سے سب برائیوں سے بچ گیا۔

حضور نبی کریم ﷺ صدق مجسم تھے۔ آپؐ نے دعوت توحید کی بنیاد ہی اپنے صدق پر رکھی۔ اعلان نبوت کے لیے جب آپ کوہ صفا پرتشریف لے گئے اور آواز دے کر مکہ والوں کو جمع کیا اور فرمایا ''اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر آنیوالا ہے تو کیا تم میری بات مان لو گے؟ سب لوگ ایک ساتھ بولے۔ ہم نے آپ ﷺ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں سنا، تو آپ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں شدید عذاب کی خبر دیتا ہوں اور اس سے ڈراتا ہوں۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ اپنے اولین جلو سے آخری جھلک تک صداقت کا ایک دلنواز اور ایمان افروز سراپا ہے۔ اعلان نبوت کے بعد جب کفار مکہ آپ ﷺ کے مخالف ہوگئے تو وہ آپ ﷺ کے خلاف ہزار باتیں کہتے تھے مگر پھر بھی آپ ﷺ کو الصادق و الامین کہہ کر پکارتے تھے۔ ابوجہل اور ابوسفیان جیسے شدید مخالفت رکھنے والے بھی آپ کے صدق کے معترف تھے۔ ان تمام بیانات کی روشنی میں صدق کو تین شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے قلبی

،قولی اور عملی ہر لحاظ سے صداقت کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

1- **زبان کی صداقت**

زبان کی سچائی سے مراد ہے کہ زبان سے جو کچھ بھی بولا جائے وہ سچ ہو اور حقیقت کے خلاف کوئی حرف زبان سے نہ نکلے ، اسے قولی صدق بھی کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

'' اُس شخص پر وبال ہے ، وبال ہے، وبال ہے جو محض دوسروں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بات سناتا ہے۔''

سچائی کی بات کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے صادقین اور منافقین کو ایک دوسرے کے مقابل بیان کیا ہے۔قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

'' تا کہ اللہ تعالیٰ سچوں کو اُن کے سچ کی جزا دے اور جھوٹوں اور منافقوں کو عذاب دے''

اسی مضمون کو حدیث نے ان الفاظ میں بیان فرمایا۔

''منافق کی تین نشانیاں ہیں:

☆ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

☆ جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے۔

☆ جب کوئی امانت اُس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

'' مومن ہر خصلت پر پیدا ہوتا ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے''

2- **قلب کی صداقت**

صدق قلب سے مراد یہ ہے کہ نیت و ارادہ خالص ہوں۔صداقت قلب کا دوسرا مفہوم خلوص ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ دین خلوص کا نام ہے۔ جو اللہ سے اُسکی کتاب سے اُس کے رسول سے اور مسلمانوں کے اماموں اور ان کے

عوام سے ہو۔ اس سے معلوم ہوا صدق اور ایمان ایک ہیں۔ مومن کا صدق دل یہ ہے کہ وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اللہ سے اُسکی کتاب سے اور حضور نبی کریم ﷺ اور مومنین سے محبت رکھتا ہو۔ دل کی سچائی کو استقامت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

''بے شک جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر
ثابت قدم رہے''

گویا صدق نیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان پختہ نیت و ارادہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدوجہد کا عزم رکھے اور جو کچھ زبان سے کہے اُسکا قلب اُسکی تصدیق کرے۔

3- **عملی صداقت**

عملی صداقت سے مراد ہے عمل کی سچائی، کہ آدمی اپنا ظاہر و باطن ایک جیسا رکھے۔ جو عزم و وعدہ کرے اُسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی پوری کوشش کرے۔ اور جو عمل بھی کیا جائے وہ ریاکاری اور نمودونمائش سے بالکل پاک ہو، صاف ہو۔ ایمان وعمل کو یکجا کر کے صدق کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''مسلمان تو وہ ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے
پھر کسی قسم کا شک نہ کیا اور اللہ کے راستے میں اپنی جانوں اور
مالوں سے جہاد کیا یہی لوگ سچے ہیں''

اور جو لوگ متزلزل ارادوں کے مالک ہیں قرآن حکیم نے انھیں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

''رسول ﷺ کی فرمانبرداری چاہیے اور صحیح جواب دینا چاہیے
اور جب معاملے کا ارادہ کرلیں تو پھر لوگ خدا سے سچے رہیں
تو یہی ان کے حق میں بہتر ہوگا۔''

صدق عمل کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کیے گئے عہد پر

ثابت قدم رہے۔ ایسے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے سچا کہا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

'' مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ جو عہد کیا اس پر پورا اُترے''

مزید ارشاد ہوتا ہے:

'' نیکی یہ ہے کہ کوئی اللہ پر، آخرت پر، فرشتوں پر، کتابوں اور انبیاء پر ایمان لائے اور مال کو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے، زکوٰۃ دے جب کسی بات کا عہد کرے تو اُسے پورا کرے۔ تنگی، تکلیف اور لڑائی میں صبر سے کام لے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے سچ کہا''

سچ بولنے والوں کے لیے اللہ نے جنت کا وعدہ کیا ہے۔ اس لیے اپنے بندوں کو حکم دیا **"کونو مع الصادقین"** اور راست بازوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

توکّل

توکّل کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام ذرائع اختیار کر لیے جائیں جو کسی مقصد کے حصول کے لیے درکار ہیں اور پھر اسی مقصد کے نتائج کے لیے اللہ پر بھروسہ کیا جائے۔ مقامات یقین میں سے سب سے اعلیٰ مقام توکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

☆ '' بے شک اللہ توکل رکھنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔''

گویا جو لوگ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اللہ ان کو اپنا حبیب بنا لیتا ہے اور ان سے محبت فرماتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے:

☆ '' اور معاملہ میں ان سے مشورہ لیتے ہیں اور جب آپ پکا ارادہ کر لیں تو

پھر اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ بے شک اللہ بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے‘‘

☆ اگر اللہ تمہاری مدد کریگا تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکے گا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دیگا تو اُس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے۔ تو مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

☆ آپ ﷺ ان منافقوں سے درگذر اور خدا پر بھروسہ رکھیں اور اللہ کام بنانے والا ہے۔

☆ اور جو خدا پر بھروسہ رکھے گا تو اللہ ہی اُس کے لیے کافی ہے۔

اور سورۃ ابراہیم میں ارشاد ہوتا ہے:

☆ ’’ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ رکھیں جبکہ ہماری زندگی کی راہوں میں اُس نے ہماری راہنمائی فرمائی، جو تکلیفیں تم ہمیں دے رہے ہو ان پر ہم صبر کریں گے اور توکل کرنے والوں کو خدا پر ہی بھروسہ رکھنا چاہیے۔‘‘

ان آیات قرآنی سے واضح ہوتا ہے کہ توکل ایمان کے خالص ہونے کی نشانی ہے۔ اور اللہ پر بھروسہ کرنے کے بعد کسی بھروسے کی ضرورت نہیں وہ اکیلا ہی کافی و شافی ہے۔ نیز جس اللہ پر بھروسہ کیا جا رہا ہے وہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا اور ہر چیز اُس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اُس کا علم تمام عالم پر محیط ہے اور وہ زبردست حکمت و قوت والا ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ جب آپ کسی کام کا پکا ارادہ کریں تو اس پر ڈٹ جائیے اور اپنا کام کیجئے اور پھر اللہ پر بھروسہ رکھیے۔ یہاں ارادے کی پختگی بھی محنت و کامیابی کا راز بتائی گئی ہے۔ جب انسان پکے ارادے سے کسی کام کے حصول پر ڈٹ جائے تو نتیجے کے لیے اللہ پر بھروسہ رکھے انشاء اللہ اگر مقاصد نیک ہوں گے تو اللہ کی طرف سے مدد کی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اس کی ذات پر بھروسہ کیا جائے اس لیے کہ اللہ پر توکل ہی بندے کو اللہ کے قریب کرتا ہے۔ ہر

معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا ، اللہ کی ہدایت سے ہے۔حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں۔فرمایا نبی کریم ﷺ نے:

''اگر تم اللہ پر توکل کرو گے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو
وہ تم کو اس طرح روزی دے گا جس طرح پرندوں کو دیتا ہے
کہ وہ صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس
لوٹتے ہیں۔'' (مشکوٰۃ)

حضرت عمر بن العاصؓ روایت کرتے ہیں فرمایا نبی کریم ﷺ نے:

''آدمی کا دل ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے تو جو شخص اپنے دل
کو اس طرح بھٹکنے پر چھوڑ دے گا تو اللہ کو اس بات کی کچھ
پروانہیں کہ کونسی وادی اسے ہلاک کرتی ہے۔مگر جو شخص اللہ
پر بھروسہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے ایسے راستوں اور وادیوں
میں بھٹکنے سے اور تباہ ہونے سے بچالے گا۔'' (مشکوٰۃ)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ کو اپنا کارساز اور وکیل نہیں بناتا تو وہ پریشانیوں میں گھرا رہتا ہے۔اس کے دل کو اطمینان حاصل نہیں ہوتا اس کے برعکس جو شخص اللہ کو اپنا کارساز حقیقی سمجھتا ہے وہ اطمینان قلب کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا:

''خوب محنت کرو اور پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو''

حدیث شریف میں آتا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ میری اُمت میں سے ستر
ہزار آدمی بغیر حساب کتاب کے بخش دیئے جائیں گے اور یہ
وہ افراد ہیں جو اپنے پروردگار پر توکل اور اعتماد رکھتے ہیں۔''

حضور نبی کریم ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس بات کا شاہد ہے کہ آپ ﷺ ہر آن ، ہر گھڑی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتے تھے۔حضرت جابرؓ روایت

کرتے ہیں۔ ایک دفعہ حضورﷺ نجد سے واپسی پر کیکر کے درخت تلے آرام فرما رہے تھے۔ آپﷺ کی تلوار درخت کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔ ایک اعرابی آیا اور تلوار اُٹھا کر حضورﷺ سے کہنے لگا کہ اب کون آپ کو مجھ سے بچائے گا۔ آپﷺ نے تین بار فرمایا۔ اللہ اللہ اللہ۔ یہ الفاظ سن کر تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور حضورﷺ نے اسے اُٹھا لیا اور اس اعرابی سے پوچھا اب تو بتا تجھے کون بچائے گا۔ وہ کانپنے لگا۔ آپﷺ نے فرمایا۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آ مگر اُس نے انکار کر دیا لیکن یہ عہد کیا کہ وہ کبھی آپﷺ کے مقابلے میں نہیں آئے گا اور نہ اُن کا ساتھ دے گا جو آپ سے لڑیں گے۔ آپﷺ نے اسے چھوڑ دیا۔

آپ کے توکل کی انتہا تو یہ ہے کہ ہجرت مدینہ کے وقت کفار قریش نے چاروں طرف سے گھر کو گھیر رکھا ہے مگر آپﷺ کو اپنے اللہ پر پورا بھروسہ ہے آپ اسی گھیراؤ میں سے نکل کر ہجرت کر جاتے ہیں اور غار ثور میں حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے ہمراہ قیام فرماتے ہیں۔ دشمن سر پر پہنچ جاتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ یہ دیکھ کر گھبرا گئے کہ مبادا دشمن دیکھ نہ لے آپﷺ اس نازک وقت پر بھی صدیق اکبرؓ کو ان الفاظ میں تسلی دیتے ہیں:

لا تحزن ان الله معنا غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اس طرح حضرت لقمان کی ایک روایت منقول ہے:

> جو اللہ پر توکل کرے اور قضائے الٰہی کو تسلیم کرے اور ہر معاملہ اللہ کے سپرد کر دے اللہ کی تقدیر پر راضی رہے تو اس نے دین کو قائم کیا اور بھلائی کمانے کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں فارغ کر لے اور جو ایسے اخلاق صالحہ پر قائم ہوا تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر معاملے کی اصلاح کر دیتے ہیں۔

ابو محمد سہلؒ علمائے ابدال میں سے تھے فرماتے ہیں:

"سارے کا سارا علم عبادت کا دروازہ ہے اور سارے کا سارا

تقویٰ زُہد ہے اور سارے کا سارا زُہد توکل کا دروازہ ہے
توکل کی کوئی حد نہیں کہ کہیں جا کر ختم ہو جائے۔ تقویٰ اور
یقین ترازو کے دو پلڑے ہیں اور توکل اس کا کانٹا ہے اسی
کے ذریعے کمی بیشی کا پتہ چلتا ہے۔"

توکل تدبیر اور کوشش کے ساتھ

عام طور پر توکل کا یہ معنی لیا جاتا ہے کہ کسی کام کے لیے کوشش نہ کی جائے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے کہ خدا نے جو کچھ کرنا ہے کر دے گا اور جو تقدیر میں لکھا ہے مل جائے گا نہ کام کرنے کی ضرورت ہے نہ تدبیر کرنے کی۔ توکل کا یہ مفہوم سراسر غلط ہے توکل تو کسی کام کو پوری کوشش اور تدبیر کے ساتھ انجام دینے کا نام ہے۔ کوشش اور تدبیر کرنا انسان پر فرض ہے، پھر نتیجے کے لیے اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ سے یہی مطلب واضح ہوتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت کی اس میں توکل تدبیر اور کوشش ساتھ ساتھ ہیں۔ کیونکہ ان تینوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"کوشش کرو کیونکہ اللہ نے تم پر کوشش کرنا فرض قرار
دیا ہے۔"

ایک اعرابی نے آپ ﷺ سے پوچھا میں اپنے اونٹ کو باندھ کر اللہ پر بھروسہ کروں یا کھلا رکھ کر۔ آپ ﷺ نے فرمایا پہلے تم اسکو باندھ پھر اللہ پر بھروسہ رکھو۔

چنانچہ جائز کام کی کوشش کرنا توکل کے خلاف نہیں، البتہ کامیابی کے لیے بھروسہ اپنی کوشش پر نہیں خدا کی رحمت پر ہونا چاہیے۔

ایفائے عہد

ایک مومن کی صفات میں ایفائے عہد بھی اہم مقام رکھتا ہے۔ ایفائے عہد سے مراد ہے اپنے وعدے کی پابندی کرنا ہے۔ منافق کی نشانیوں میں سے حضورﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ جب عہد کرے تو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ چونکہ مومن منافق نہیں ہوتا اس لیے مومن اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

☆ اور (مومن) اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے ہیں جبکہ وعدہ کر چکے ہوں۔

مزید ارشاد خداوندی ہے:

☆ اور عہد کی پابندی رکھو بے شک عہد کے متعلق باز پُرس ہوگی۔

☆ اور آپ اس کتاب میں اسماعیلؑ کا بھی ذکر کیجئے کہ وہ وعدے کے بڑے ہی پکے تھے اور اللہ کے سچے نبی اور رسول تھے۔

ایفائے عہد خدا کی بھی صفت ہے

اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے بارے میں جا بجا فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ فرمایا:

اور اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

اور بیشک اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا۔

اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنے وعدے کو پورا کرنے والا ہے۔

وعدے کو پورا نہ کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

''ان کو وعدہ توڑنے کی وجہ سے اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان کے دل کو سخت کر دیا''

حضور نبی کریمﷺ کے اسوہ حسنہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے حضور

نبی کریم ﷺ کی زندگی بھی ایفائے عہد سے عبارت تھی۔ اعلان نبوت سے قبل کا ایک واقعہ مذکور ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عبداللہ بن ابی الحمساء سے وعدہ کی بنا پر آپ تین دن اور تین راتیں ایک ہی جگہ کھڑے رہے اور ایفائے عہد کی لازوال مثال قائم کر دی۔

روایت ہے کہ جنگ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل تھی اور مسلمانوں کو ایک ایک آدمی کی اشد ضرورت تھی۔ دو صحابہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے یا رسول اللہ ﷺ ، ہم مکہ آ رہے تھے۔ کہ راستے میں کفار نے ہم کو گرفتار کر لیا اور اس شرط پر رہا کیا کہ ہم لڑائی میں آپ ﷺ کا ساتھ نہ دیں مگر یہ وعدہ مجبوری میں کیا گیا ہے۔ ہم ضرور کافروں کے خلاف لڑیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہرگز نہیں تم اپنا وعدہ پورا کرو اور لڑائی کے میدان سے واپس چلے جاؤ ہم ہر حال میں وعدہ پورا کریں گے ہم کو صرف اللہ کی مدد درکار ہے۔

غرض حضور نبی کریم ﷺ نے کافروں کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کو بھی پورا کرنا ضروری سمجھا۔ حالانکہ اس وقت ایک ایسی جنگ درپیش تھی جس میں مسلمانوں کی تعداد کافروں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھی۔ غرض معاہدہ چاہے دو افراد کے درمیان ہو، دو جماعتوں کے درمیان ہو یا دو قوموں کے درمیان یا زندگی کے عام معاملات سے تعلق رکھتا ہو اسے پورا کرنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

عفوو درگزر

عفو کا مطلب ہے مٹا دینا، محو کر دینا۔ جو شخص کسی زیادتی کرنے والے کو معاف کر دیتا ہے وہ گویا اس کی زیادتی کے خیال کو دل و دماغ سے محو کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام 'العفو' بھی ہے یعنی معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ خود بھی اپنے بندوں کو کثرت سے معاف فرماتا ہے

اور اپنے بندوں کے بارے میں بھی یہی پسند فرماتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی خطاؤں اور زیادتیوں کو معاف کر دیا کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا میں عفو نہ رہے اور ہر انسان دوسرے سے پورا پورا بدلہ لینے پرتُل جائے تو زندگی کی بہت سی خوبصورتی ختم ہو جائے اور دنیا میں عام بربادی پھیل جائے۔ حضرت ابو الدرداؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریمﷺ کو فرماتے سنا کہ:

"جس شخص کے بدن کو کوئی تکلیف پہنچے اور وہ تکلیف پہنچانے والے سے اس کا بدلہ نہ لے بلکہ اُسے معاف کر دے تو اللہ اس کے باعث اس کا ایک درجہ بلند کرے گا یا اس کا ایک گناہ معاف فرما دے گا۔"

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے فرمایا نبی کریمﷺ نے:

"اچھی سیرت وخصلت کے مسلمان سے اگر کوئی لغزش ہو جائے تو اس کو معاف کر دو سوائے حدود کے۔"

یعنی اگر کسی نیک اور پرہیزگار شخص سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس کی وجہ سے اسے نظروں سے نہ گرا دو۔ اس کی بے وقعتی نہ کرو اس کی غلطی کو پھیلاتے مت پھرو۔ بلکہ معاف کر دو ہاں اگر وہ ایسا گناہ کرے جس کی سزا شریعت میں مقرر ہے تو ایسے گناہ معاف نہیں کیے جائیں گے۔

بدلہ لینے کی قدرت رکھنے کے باوجود دوسروں کو معاف کر دینے کی بڑی فضیلت ہے۔ آپﷺ فرماتے ہیں کہ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا اے میرے رب آپ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ کونسا شخص ہے۔
اللہ تعالیٰ نے کہا:
وہ شخص جو انتقامی کارروائی کی قدرت رکھنے کے باوجود معاف کر دے۔

نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ سے ہمیں عفو و درگزر کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں:

''حضور ﷺ کسی کو برا بھلا نہیں کہتے تھے۔ برائی کے بدلے برائی نہیں کرتے تھے۔ معاف کر دیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملے میں انتقام نہیں لیا۔ آپ نے اپنے کسی خادم کو عورت کو جانور، کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا آپ سب کی خطائیں معاف کر دیا کرتے تھے۔''

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ طائف کے محاصرے کے بعد جب جعرانہ کی طرف جا رہے تھے تو آپ ﷺ کے ایک صحابی حضرت ابورہم غفاریؓ کی اونٹنی حضور ﷺ کی اونٹنی سے بھڑ گئی اور ان کے پاؤں کی رگڑ سے حضور ﷺ کے پاؤں کو تکلیف پہنچی۔ آپ ﷺ نے ابورہمؓ کے پاؤں کو کوڑے سے ٹہوکا دے کر فرمایا۔ پاؤں ہٹاؤ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔

ابورہمؓ ایک دم خوف زدہ ہوگئے کہ کہیں اس بے ادبی پر اللہ کی طرف سے عتاب نہ ہو۔ صبح کو جب جعرانہ پہنچ کر قافلہ ٹھہرا تو ابورہمؓ اونٹ چرانے نکل گئے لیکن دل میں ڈرتے رہے اسی لیے واپس آتے ہی لوگوں سے پوچھا معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے یاد فرمایا تھا۔ چنانچہ ڈرتے ڈرتے خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن یہ قیصر و کسریٰ کی شہنشاہیت نہ تھی جہاں ذرا سی بھی گستاخی پر سخت ترین سزا ملتی تھی۔ بلکہ یہ رحمتہ للعلمین ﷺ کا دربار تھا۔ جہاں رحمت اور عفو و درگزر کے سوا کچھ نہ تھا۔ جہاں آقا اور غلام، چھوٹے اور بڑے کا کوئی فرق نہ تھا۔

جب ابورہمؓ حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو حضور ﷺ نے فرمایا۔

ابورہمؓ تم نے مجھے تکلیف پہنچائی تھی اس کے بدلے میں مَیں نے تمہارا پاؤں کوڑے سے ہٹا دیا تھا۔ اب اس کے بدلے میں یہ بکریاں انعام میں لے لو۔

حضور نبی کریم ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ابورہمؓ کا چہرہ کھل اُٹھا

اور انھیں یوں محسوس ہوا جیسے حضورﷺ راضی ہوگئے ہیں تو انھیں ساری کائنات مل گئی ہے۔

اس طرح فتح مکہ کے موقع پر جب رسول اللہﷺ اس شہر میں جہاں کافروں نے آپﷺ کی دعوت کوٹھکرا دیا اور آپﷺ اور آپﷺ کے صحابہؓ کوطرح طرح سے ستا کر ہجرت کر جانے پر مجبور کر دیا، اس شان سے داخل ہوئے کہ دس ہزار جان نثاروں کا لشکر آپ کے ساتھ تھا۔ آپﷺ نے اعلان کر دیا تھا کہ جوشخص کعبے میں پناہ لے گا اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جو اپنے گھر کے دروازے بند کرے گا وہ بھی محفوظ رہے گا اور جو ابوسفیان کے گھر پناہ لے گا وہ بھی محفوظ رہے گا یہ ابو سفیان وہی تھے جو اسلام کے سخت دشمن تھے۔ جنھوں نے مدینے پر بار بار حملہ کیا عربوں کومسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور خود رسول اللہﷺ کوقتل کرنے کی سازش کی۔ مگر اب وہ کچھ دیر پہلے ایمان لے آئے تھے اور اللہ کے رسولﷺ نے ان کی ساری خطاؤں اور زیادتیوں سے درگذر فرماتے ہوئے انھیں معاف کر دیا اور ان کو یہ عزت دی کہ ان کے گھر کوکافروں کے لیے پناہ گاہ بنا دیا۔

اس کے بعد حضورﷺ نے لوگوں سے خطاب کیا۔ خطبے کے بعد آپﷺ نے مجمع کی طرف دیکھا۔ بڑے بڑے کافر موجود تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جنھوں نے حضورﷺ کی مخالفت میں دن رات ایک کر دیئے تھے۔ اسلام کو مٹانے میں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ مسلمانوں کو ایذائیں پہنچائی تھیں۔ طرح طرح کے ظلم کیے تھے۔ آپﷺ کی راہ میں کانٹے بچھائے تھے۔ آپﷺ کے بارے میں ناگوار باتیں کہی تھیں۔ ان میں وہ بھی تھے جنھوں نے آپﷺ کے صحابہؓ کوقتل کیا تھا اور خود آپﷺ کے چچا حضرت حمزہ کے خون سے ہاتھ رنگے تھے۔ آپﷺ نے ان سب کی طرف دیکھا اور پھر پوچھا۔

''اے اہل قریش آج تم مجھ سے کس قسم کے برتاؤ کی توقع رکھتے ہو۔

لوگوں نے یک زبان ہوکر کہا۔''

ہمیں آپ سے اچھے برتاؤ کی توقع ہے۔آپ ہمارے شریف بھائی ہیں، شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔

حضورﷺ تو دونوں جہان کے لیے رحمت تھے۔آپ نے سب کے لیے عام معافی کا اعلان فرمایا اور کہا جاؤ آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں تم سب آزاد ہو۔

نبی کریمﷺ کی حیات مبارکہ سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ ہم بھی دوسروں کے ساتھ عفوو درگزر سے پیش آئیں اور صلہ رحمی کا برتاؤ کریں۔

غرور وتکبّر کی حقیقت

رزائل اخلاق میں سب سے بُری عادت تکبر کرنا ہے۔تکبّر کا مطلب ہے اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کوحقیر اور اپنے سے کم سمجھنا۔تکبّر کرنا درحقیقت اللہ کے ساتھ لڑائی کرنا ہے کیونکہ کبریائی اور بڑائی کا حقدار تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔انسان کی کیا حقیقت اور اوقات ہے۔اسی وجہ سے متکبّر انسان کی مذمت کثرت کے ساتھ قرآن مجید میں موجود ہے۔ارشاد خداوندی ہے:

☆ اللہ تعالیٰ ایسے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں جو تکبّر اور جبر کرنے والے ہیں۔

☆ سورۃ مومن میں ارشاد ہے:

تحقیق میں نے پناہ مانگی اپنے اور تمہارے پروردگار سے اور ہر
غرور کرنے والے سے جو یقین نہیں رکھتا قیامت کے دن پر۔

حضور نبی کریمﷺ اکثر یہ دعا بھی مانگا کرتے تھے۔

☆ اے اللہ میں غرور وتکبّر کی ہوا سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

حضور نبی کریمﷺ نے فرمایا:

☆ جس کے دل میں رائی برابر تکبّر ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

اور جو شخص اپنے آپ کو بڑا جاننے کی عادت بنا لیتا ہے اللہ کے ہاں وہ متکبّروں میں لکھ لیا جاتا ہے اور متکبّروں کو جو عذاب ملے گا اسی سے وہ بھی دو چار ہوگا۔

مزید فرمایا متکبّر آدمی کا حشر قیامت کے دن چیونٹی کی شکل میں ہوگا ، اپنے تکبّر کے باعث اللہ کے نزدیک جو ذلت اسے حاصل ہوگی وہ اس سبب سے لوگوں کے پاؤں تلے روندا جائے گا۔ اور فرمایا دوزخ میں ھب ھب نامی ایک غار ہے جس میں غرور وتکبّر کرنے والوں کو ڈالا جائے گا۔

جب تکبّر کی اسقدر وعید سُنی تو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ تکبّر کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ کے حضور گردن نہ جھکانا اور اُسکی مخلوق کو حقارت کی نظر سے دیکھنا۔ ایک بزرگ کا قول ہے اگر تم جنت کی خوشبو سونگھنا چاہتے ہوتو اپنے آپ کو ہر انسان سے کم تر سمجھو۔

تکبّر کی بعض شکلیں بہت قبیح اور بُری ہیں۔ تکبّر یا اللہ کے مقابلے میں ہوتا ہے یا رسول ﷺ کے مقابلے میں یا بندوں کے مقابلے میں۔

پہلا درجہ اس تکبّر کا ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ہو جیسے نمرود، فرعون اور ابلیس نے کیا۔

دوسرا درجہ رسول ﷺ پر تکبّر کا ہے۔

جس طرح کفار قریش نے کیا اور کہنے لگے ہم اپنے جیسے آدمی کی بات نہیں مانیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتے کو رسول بنا کر ہمارے پاس کیوں نہ بھیجا اور انسان کو ہی بھیجنا تھا تو کسی صاحب وقار کو کیوں نہ بھیجا یتیم کا انتخاب کیوں کیا؟ (نعوذ باللہ)

اس کے متعلق قرآن پاک میں یوں ارشاد ہوا:

'' اُنھوں نے کہا کہ کیوں نہ اُتارا یہ قرآن ان بستیوں پر
(یعنی مکہ، طائف) کے کسی بڑے آدمی پر۔

تیسرا درجہ ہے کہ اپنے جیسے لوگوں کے معاملے میں تکبّر کرے اور انھیں حقارت کی نظر سے دیکھے، حق بات کو قبول نہ کرے اور اپنے آپ کو ان سے بہتر خیال کرے۔

یہ درجہ پہلے دونوں درجوں سے کم ہے لیکن بہر حال بُرا ہے۔

جولوگ متکبّر ہوتے ہیں وہ دین کے معاملات میں جھگڑتے ہیں اور جب حق بات کہی جاتی ہے تو اپنے تکبّر کے باعث اسے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

''جب کسی سے کہا جائے کہ خدا سے ڈرو اور وہ کہے میاں اپنے کام سے کام رکھو، تو ایسا کہنا سخت گناہ ہے''

ایک دن نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی سے کہا کہ دائیں ہاتھ سے کھانا کھاؤ، اس نے جواب دیا میں نہیں کھا سکتا اور اس نے ایسا تکبّر کی وجہ سے کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا اچھا یوں تو یوں ہی سہی پھر اُسکا ہاتھ اپنے اس تکبّر کے باعث ہلا ہی نہیں۔

اللہ نے ابلیس کا قصہ محض کہانی کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ اُسکا مقصد تکبّر کے نقصانات کو واضح کرنا ہے۔ ابلیس نے تکبّر ہی کی وجہ سے کہا تھا:

''میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے اور آدم کو مٹی سے بنایا''

تکبّر نے ابلیس کو اس درجے پر پہنچا دیا کہ اس نے اللہ کے حکم کی تعمیل نہ کی اور سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ جس کے نتیجے میں وہ ہمیشہ کے لیے ملعون قرار پایا۔

تکبّر کی ضد عاجزی وانکساری ہے

حضور نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں جو شخص عاجزی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے اس کی عزت بڑھا دیتے ہیں اور فرمایا ہر شخص کے سر پر دو فرشتوں کے ہاتھ میں اس کی لگام ہوتی ہے۔ جب بندہ عاجزی کا اظہار کرتا ہے تو فرشتے اسے کھینچ کر اوپر آسمان کی طرف لے جاتے ہیں اور اس کے لیے دعا کرتے ہیں۔ اے اللہ اسے سرنگوں رکھنا۔ اور فرمایا نیک بخت وہ شخص ہے جو فی الحقیقت عاجز و کمزور

نہ ہومگر اس کے باوجود عاجزی کا اظہار کرے، اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے، کمزوروں اور یتیموں، مسکینوں سے رحم دلی کا معاملہ کرے اور دانا اور اہل علم سے میل جول رکھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام صبح صبح اپنی رعایا میں سے امراء کے احوال معلوم کرتے اور خود مساکین کے زمرے میں بیٹھ جاتے اور فرماتے ایک مسکین کا یہی ٹھکانا ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ عاجزی یہ ہے کہ جب تو اپنے گھر سے باہر نکلے تو جو ملے اس کو اپنے سے بہتر سمجھے۔

حضرت مالک بن دینارؒ فرمایا کرتے تھے اگر کوئی مسجد کے دروازے پر یہ کہے اے لوگو جو تم میں سب سے بدتر ہے وہ باہر آ جائے تو میں سب سے پہل نکلوں گا۔ حضرت ابن مبارکؒ نے جب یہ بات سنی تو فرمایا مالک کی عظمت کا راز اسی عاجزی میں ہے۔

انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جتنی عاجزی و انکساری دکھائے گا اُتنا ہی اللہ اُس کے مقام میں بلندی و رفعت عطا فرمائے گا۔

غیبت

رزائل اخلاق میں غیبت کی برائی دوسرے درجے پر ہے۔ غیبت یہ ہے کہ کسی آدمی کے پس پردہ اُس کے متعلق ایسی بات کہی جائے جسے وہ اگر سن لے تو بُرا مان جائے۔ گو کہ تم نے سچ ہی کہا ہو، جس بات کا انجام کسی کے عیب کی طرف ہو اس کا بیان کرنا غیبت ہے۔ اگرچہ یہ بات اس کے بدن نسب یا کردار و گفتار کے متعلق ہو۔ بدن کے متعلق مثلاً کوئی آدمی کہے فلاں لمبا یا چھوٹا ہے، اخلاق کے متعلق کسی کو بدگو، متکبر، زبان دراز یا بزدل کہے۔ افعال میں کسی کو چور،

خائن ، بے نماز یا اس طرح کہنا کہ وہ رکوع سجود پورے نہیں کرتا۔ زکوٰۃ نہیں دیتا یا بہت سوتا ہے یا بہت کھاتا ہے۔ الغرض حضور ﷺ نے فرمایا۔ جو کچھ تم کہو کسی کے متعلق بھی جسے وہ اگر سن لے تو برا مان جائے وہ غیبت ہے۔جس طرح غیبت زبان سے حرام ہے دل سے بھی غیبت کرنا حرام ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''مسلمان کا خون، مال اوراس کی طرف سے بدگمانی حرام ہے۔''

ایسی بات دل میں لانا جسکا نہ تو یقین ہو اور نہ ہی اس کے متعلق کوئی گواہ ہوتو ایسی بات شیطان دل میں ڈالتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا:

''فاسق جب کوئی خبر تمہارے پاس لائیں تو تحقیق کرلیا کرو۔''

غیبت کا وبال بہت سخت ہے۔ قرآن حکیم نے غیبت کو مردہ بھائی کا گوشت نوچنے سے تعبیر فرمایا ہے۔حضور نبی کریم ﷺ نے اسے زنا سے بدتر قرار دیا اوراس سے مسلمانوں کو بچنے کی ہدایت کی۔ کیونکہ زنا کرنے والے کی توبہ قبول ہو جاتی ہے مگر غیبت کرنے والے کی توبہ کبھی قبول نہیں ہوتی جب تک کہ جس کی غیبت کی ہو اس سے معافی نہ مانگ لے۔

حضور نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ شب معراج ایک قوم کو میں نے دیکھا جو اپنے چہرے کا گوشت ناخنوں سے نوچ رہی تھی۔ میں نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ غیبت کرنے والے ہیں۔ حضرت سلیمان بن جابرؓ کو حضور ﷺ نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

☆ نیکی کے کام کو حقیر مت جانو اگرچہ وہ محض اتنی ہو کہ ڈول سے کسی کے برتن میں پانی ڈال دو۔

☆ اپنے مسلمان بھائی سے کشادہ دلی سے ملنا اور کسی کی غیبت مت کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ غیبت سے توبہ کر کے مرنے والا سب سے آخر میں جنت میں جائے گا اور بغیر توبہ کیے مرنے

والا سب سے پہلے دوزخ میں جائے گا۔

غیبت در حقیقت دل کی بیماری ہے اور اس کا علاج کرنا بہت ضروری ہے۔ اس علاج کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو احادیث غیبت کی برائی میں بیان ہوئی ہیں اُن پر غور کیا جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ غیبت سے میری نیکیاں دوسروں کے نامہ اعمال میں منتقل ہو رہی ہیں۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو میں خالی ہو جاؤنگا۔ کیونکہ حدیث میں آتا ہے:

> ''غیبت اور حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتے ہیں جیسے آگ خشک لکڑیوں کو''

دوسرے اس بات کا خیال رکھے کہ میری ذات میں بھی عیب ہیں۔ دوسرا انسان بھی میری ہی طرح معذور ہے۔ اگر اپنی ذات میں کوئی عیب نظر نہ آئے تو سمجھ لے یہ سب سے بڑا عیب ہے۔

غیبت کا کفارہ توبہ اور پشیمانی ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نجات نصیب ہو۔ جس کی غیبت کی ہے اس سے معافی مانگے ورنہ ایک دن آنے والا ہے جب اس کی نیکیاں بدلے کے طور پر مظلوم کو دی جائیں گی۔ اگر نیکیاں نہ ہوں گی تو اس کے گناہوں کا بوجھ اس کے سر ڈال دیا جائے گا۔